جائے گا۔"

میں نے کہا "الحمد شریف پڑھنے کے لیے مجھے آمین سے شروع کرنا ہوگا؟ یعنی پہلے آمین' پھر ولد آلین پھر علیہم....."

بات کاٹ کر بولے "اس طرح سے الٹ نہیں معنی کے اعتبار سے الٹ۔ میرے ساتھ ساتھ پڑھیے۔"

"لا بسم اللہ..... لار حمٰن..... لار حیم....."

"نعوذ باللہ..... نعوذ باللہ..... نعوذ باللہ..... میری زبان کو تالا لگ گیا اور میرا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ نفی کے انداز میں سورۃ پڑھتا گیا اور لہراتا گیا۔ میں خوف کے مارے "اسے روک بھی نہ سکا' اس کی شیطنت کا ہالا بڑا گہرا' بہت مضبوط اور بے حد دبیز تھا۔ میں نے دل ہی دل میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ تیزی کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا تو وہ رک کر بولا "یہ جو تم اندر ہی اندر کچھ پڑھ رہے ہو' اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا..... وہ لوگ جنہوں نے خواہش کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے جب وہ کچھ پڑھتے ہیں تو اس کا کوئی اثر کسی پر بھی نہیں ہوتا۔ تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو' اس لیے اپنی کوشش ضائع نہ کرو۔

میں پتھر کا بت بن کر ابلیس کے سامنے گم گما گیا اور مجھ میں ہلنے کی سکت باقی نہ رہی۔ ہلنا تو ایک طرف مجھ سے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں ناک کے بانسہ سے آ لگیں اور اس نے ہاتھ جھٹک کر ایک دو موہی گندی گالی دے کر کہا "جا دفع ہو جا گورے دنبے تجھے خباثت کی نعمت کبھی نہ ملے اور تو نیکی کے پیچھے ہاتھ ملتا ملتا دھوئیں کی لکیر بن کر معدوم ہو جائے۔ جا؟ دفع ہو جا..... تیری ماں تجھے روئے اور تیری بہنیں تیرا سیاپا کرتی پھریں۔"

وہ بڑے جلال میں تھے اور دائیں بائیں تھوک رہے تھے۔ پھر وہ بھڑک کر اٹھے اور چلا کر بولے "بند کر' بند کر' یہ پڑھنا بند کر نہیں تو میں تجھے کماد کے پتے کی طرح چیر کر دو کر دوں گا۔"

ان کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ پڑھنا پڑھانا تو ایک طرف میرا تو دم بھی مقام واپسیں پر پہنچ کر اٹک گیا تھا۔

خوشی محمد نے گھبرا کر پردے کا ایک کونہ اٹھایا تو مجھے اندر آنے والی روشنی سے بھاگنے کا اذن ملا۔ کسی نے میرے دونوں کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر مجھے گھمایا اور باہر کی روشنی کا

ایک کوندا میری طرف جھپٹا۔ کچھ اسی کوندے کی لپک اور کچھ کندھوں پر مضبوط ہاتھوں کی گرفت کا دھکا' میں رپٹ کر سڑک پر آ گیا۔

پھر جو میں پاگلوں کی طرح یونیورسٹی گراؤنڈ کی طرف بھاگا تو کئی موٹروں کی بریکیں چیخیں اور کئی بھاگتے گھوڑوں کی راسیں کھنچیں' مگر میں ان جھپٹوں سے زندہ سلامت نکل ہی گیا۔

یونیورسٹی گراؤنڈ کی دیوار سے لگ کر میں نے سانس ہموار کرنے کی کوشش کی تو میرے اندر سے غوں غم گلٹ کر کے بدبو کا ایک بلبلا نکلا جیسے بند گٹر کے اندر سے بدبو کا ایک صوتی بھبکا اٹھا کرتا ہے اور گٹر کے اندر چلنے والا دھیما دھیما پانی ایک طرف ہو کر بلبلے کو راہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بدبو مردہ کتوں کی لاشوں' گدھوں کے خون اور چربی سے لتھڑے پنجوں' غرقی کے اندر سیاہ فضلے کی گھانی' بے طہارت بوڑھے کے تہہ' فوڈ پوائزن والی لڑکی کی قے' بال صفا پاؤڈر کی مہک اور کوہستانی بچے کے بب کا امتزاج تھی۔ میں جوں جوں اس سے دور بھاگتا تھا' یہ میرے جسم کے ہر رگ وریشہ سے آواز دے کر نکل رہی تھی جیسے سرتانگے کے کسی گھوڑے کے بدن سے ٹاپ کے ساتھ ساتھ جسم کا بھبکارا بھی نکلا کرتا ہے۔

میں نے ابھی اپنی بدبختی کا اعلان بھی نہیں کیا تھا صرف اشارت کی تھی اور اس کے بدلے میں مجھ پر یہ لعنت مسلط ہو گئی تھی۔ اگر میں اقرار کر لیتا یا ارادہ باندھ لیتا' یا اس طرف کارخ کر لیتا تو پھر پتہ نہیں مجھ پر کیا گزرنی تھی۔ تین دن اور تین راتیں مجھ پر قیامت بن کر گزریں اور میں گھر والوں سے بہت پرے رہ کر وقت کو دھکے مارتا رہا۔ اس عرصے میں مجھے جو کچھ بھی آتا تھا' میں نے پڑھا' جو ورد مشکل نظر آتا تھا کیا۔ لائی سول ڈال کر دن میں تین تین مرتبہ غسل کیا' لیکن بدن سے برآمد ہونے والی بدبو کم نہ ہوئی۔ جلد بھی جگہ جگہ سے کھرستی گئی اور چیاں پڑ گئیں۔ ہڈیوں کی تنی ہوئی کمانیاں بھی ڈھیلی پڑ گئیں اور جسم میں جگہ جگہ چپ پڑ گئے۔

انسان بلاارادہ' بے پتا' بے اختیار اور بے محل شیطان کی پیروی کرے اور اسے اپنی جبلت کی وجہ سے سمجھتا رہے تو اس کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا' لیکن اگر وہ با اختیار و با ارادہ دائرہ شیطان میں داخل ہونے کا پروگرام بنائے اور اس کو ایک شنیع فعل نہ سمجھے تو پھر اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس کے تہیہ کو پختہ کرنے کے لیے شیطان کے علاوہ اور دوسری مثبت طاقتیں بھی اس کی مدد کرتی ہیں اور اس کی ذرا سی آرزو کو وسعت عطا کر کے

OCIETY.COM

اسے شیطانی ہیکل میں دھکیل دیتی ہیں۔ چلتی ہوئی تیز ہوائیں' سمندروں کی لہریں' کشش ثقل کی مسلسل کھینچ' موسموں کے تغیر و تبدل' چاند کا جذب' سورج کی تپش یہ سب اس کے ارادے کو تقویت عطا کر کے اسے تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ اس کی طرف رخ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ رخ تو ایک طرف ایسا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ بس اسے ایک خوفناک اور خونخوار دیوانہ کتا سمجھ کر اس کے قریب سے آنکھ بچا کر گزر جانا چاہیے۔ اس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا نہیں چاہیے۔

شیطان تو زندگی میں اکثر ملتا رہا ہے۔ ملتا رہتا ہے۔ ملتا رہے گا۔ ہمارے اور اس کے راستے ایک دوسرے کو کراس کرتے ہیں' لیکن عافیت اسی میں ہے کہ ان راستوں پر سر نیہوڑ کر کندھے جھکا کر' سانس روک کر اپنی چال چلتے ہوئے گزر جائے۔ نہ جلدی کرے' نہ رکے' نہ ان کو پتہ چلنے دے کہ کوئی ڈرا ڈرا سا گزر رہا ہے۔ بس ایک مرتبہ ان کے محاذ سے نکل گیا تو اگلی نکڑ خود گھوم کر قریب آجائے گی اور گلی آپ سے آپ مڑ جائے گی۔

میں شیطان کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہوں۔ بہت بڑی طاقت ہے۔ بڑے بڑوں کا لوہا ان کے آگے پانی ہو گیا۔ ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ جب بھی گزرو' ادب سے گزرو۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرو' ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ جب تک زندہ ہیں ان سے ملاقات تو ہوتی رہے گی۔ ان کا کام ہی لوگوں کو اغوا کرنا ہے۔ دوسرے تو تاوان لے کر چھوڑ بھی دیتے ہیں' یہ گھر آئے ہوئے کو جانے نہیں دیتے پکڑے ہوئے کو چھوڑتے نہیں۔ اپنی محبت میں مبتلا کر کے گھر داماد سا بنا لیتے ہیں۔

میں متجسس ضرور تھا لیکن بدنیت نہیں تھا۔ مجھے تجسس نے مارا اور اپنی ذات میں ذلیل کر کے چھوڑ آیا۔

ایک ہفتہ کے بعد مجھ سے بدبو آنا تو بند ہو گئی' البتہ میرے وجود میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی کہ میں خود کو ایک لال بیگ سمجھنے لگا۔ سمجھنے کیا لگا میرے اندر ایک کاکروچ کی صفات پیدا ہو گئیں۔ ویسے ہی چلنا' اسی طرح سے رکنا' کسی کو دیکھ کر رک جانا' کوئی نظر بھر کے دیکھ لے تو وہاں سے بھاگ کر کسی کونے میں چھپ جانا۔ میں بظاہر تو ایک انسان تھا' لیکن میرے اندر ایک بینڈا بول رہا تھا' جس کی آواز صرف مجھے سنائی دیتی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے اندر کا خون سفید ہو چکا ہے۔ شیو کرتے ہوئے مجھے ایک مرتبہ شک لگا تھا تو میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تھا کہ کسی اور نے تو آئینے میں میرے خون کی رنگت نہیں دیکھی' جس

طرح ایک کاکروچ سیدھا چلتا ہوا بھی پہلوؤں کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے' کچھ ایسی ہی تبدیلی میری چال میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔

میرے سنگی ساتھیوں اور میرے گھر والوں کو تو اس تبدیلی کا علم نہ ہوا' لیکن میری ماں میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بار بار پوچھتی رہی "کاکا تیرا جی تو ٹھیک ہے؟"

میں ماں کو گھور کر دیکھتا تھا اور کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ مجھے وہ ایسا سوال کرتی ہوئی بہت بری لگتی تھی' کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں مر جاؤں گا اور مر کر کسی غلط مقام پر پہنچ جاؤں گا۔

اور پھر ایسے ہی ہوا۔ ایک شام لارنس باغ کے باہر میاں بشیر کی کوٹھی کے سامنے ایک تیز رفتار کار نے مجھے ٹکر ماری اور مجھے سڑک پر تڑپتا چھوڑ کر بھاگ گئی۔ لوگوں نے اٹھا کر مجھے گنگا رام ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا اور خود چلے گئے۔

پورے چوبیس گھنٹے موت و حیات کی کشمکش کے بعد مجھ سے میرے استاد بھائی بالی ملنے کے لیے آئے۔ وہ میرے بستر کے سامنے کرسی پر بیٹھے مسکرا رہے تھے' لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ موت و حیات کی کشمکش کے بعد وہ موت کے اندر تشریف لائے ہیں یا حیات نو پا چکنے کے بعد آئے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر' سر ہلاتے ہوئے پوچھا "ٹھیک ہو؟" میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے ہاتھ گھما کر کہا "پتہ نہیں' ٹھیک ہی ہوں۔"

انہوں نے کہا "خیر ہو گئی شفائی' وقت ٹل گیا۔"

میں نے پوچھا "میں بچ گیا؟"

بولے "دونوں طرح سے' یوں بھی اور دوں بھی۔"

مجھے ان کی بات ٹھیک سے سمجھ نہ آئی' کیونکہ جب کوئی بچتا ہے تو یوں ہی بچتا ہے' دوں کس طرح سے بچا کرتا ہے۔"

جب ڈاکٹر اندر داخل ہوا تو استاد مکرم کرسی سے اٹھ گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر وہاں بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر نے ایکسرے دیکھتے ہوئے کہا "شکر ہے سر پر ایسی کوئی چوٹ نہیں آئی' جس سے کسی مستقل نقصان کا اندیشہ ہوتا۔ یہ بس اوپری چوٹیں ہیں۔ ان کا کوئی اندیشہ نہیں۔ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

اس حادثے کا یہ فائدہ ہوا کہ میرا کاکروچ مر گیا اور ساری نحوست خود بخود دور ہو گئی!

۱۹

پاکستان کی گاڑی ایک مرتبہ پھر بڑی تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی تھی اور طے شدہ مقامات پر گھڑنت آوازیں نکالتی کانٹے پر کانٹا بدلتی جا رہی تھی۔ ملک اوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا اور پہلے کے مقابلے میں ہر طرح سے پھیل کر وسعت پذیر ہو رہا تھا۔ لوگوں نے باہر جانا شروع کر دیا تھا۔ باہر کی دولت اندر آ رہی تھی۔ نئی نئی کرنسیاں' بھاری بھر کم بینک ڈرافٹ' غیر سرکاری مگر معیاری ہنڈیاں' انتقال زر کے نئے نئے طریقے' کچھ نیا نیا اور سا ہو رہا تھا۔

پرانے طریق معدوم ہو رہے تھے اور وہ فن جو ہم نے بڑے جوکھوں سے سیکھا تھا کہ ایک مکان یہاں کھلوا کر الاٹ کرالو' دوسرا کسی قریبی شہر میں' تیسرا کسی اور ضلع میں اور زمینوں کے نمبر ڈلوالو۔ زراعت نہ بھی کی ہو تو اب کرالو۔ اب بھی دل نہ کرے تو زمین الاٹ کرا کے ٹھیکے پر دے دو۔ کرایہ جمع کر کے قرضہ دے دو۔ چھوٹے موٹے ساہوکارے سے نئی زندگی کی ابتداء کرلو۔ مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ دے دو۔ مدرسے کے لیے زکوٰۃ نکال دو۔

بس اس قسم کی چھوٹی چھوٹی بھوت پھسریاں تھیں جو ہم نے بڑی محنت سے ایک دوسرے سے سیکھ کر اپنی زندگیاں بنالی تھیں اور اپنے اعمال ضائع کر دیے تھے۔ اور اب لوگوں نے ان ضائع شدہ اعمال کے قفقس کی راکھ سے نئے انداز کے بے شمار قفقس بچے پیدا کر لیے تھے جو اعمال کے بچے کھچے بل کھاتے کرموں کو اپنی چونچوں میں دبا کر بھاگتے تھے اور ایک دوسرے سے اس کا کرم چھیننے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔

ترقی کی منازل تیزی سے طے کرنے کا یہ بڑا ہی سہانا دور تھا اور اس کی پیروی میں میں خوشی محمد کے ڈیرے پر گیا تھا' لیکن اپنی کم سوادی' بے عقلی اور بزدلی کی مار کھا کر واپس آ گیا تھا اور اب پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بے مصرف گھوم رہا تھا۔

جب سیاست کے وسیع سمندر میں داخل ہو کر بحری قزاق کی طرح ایک آنکھ پر اندھیاری لنکا کے لوگوں کو لوٹنے کی خواہش پوری نہ ہوئی تو میں نے ملک التجار بننے کا پروگرام بنایا اور دفتر سے چھٹی لے کر کراچی پہنچ گیا۔ تجارت کے سارے راستے تنی ہوئی ہتھیلی کی طرح کھلے تھے اور کویت 'دبئی' قطر' شارجہ' سعودی عرب' لیبیا کی منڈیاں بیلی ڈانسر کی طرح آنکھیں مار کر قریب بلا رہی تھیں' جو کوئی ان کے قریب جا کر گلے میں بانہیں ڈال دیتا تھا اسے مالا مال کر دیتی تھیں۔

کراچی کے بالاخانوں میں درآمد برآمد کے بڑے بڑے تاجر بیٹھے تھے جو اپنی اپنی تجارتوں کو ہل دے دے کر آگے پھیلا رہے تھے۔ ان میں تیل کے تاجر' کیمیکلز امپورٹر' سپورٹس گڈز کے سپلائر' کپڑے کے بیوپاری' ردی کے تھوک فروش' بائی کارک کے امپورٹر' جوٹ مال کے انڈینٹر' کھالوں کے ایکسپورٹر' کپڑے کے تاجر اور تلے کے سمگلر بیٹھے تھے۔

میرے پاس کل تین ہزار روپے تھے جن میں سے پانچ سو میں گھر چھوڑ کر چلا تھا۔ کچھ واپسی کے سفر خرچ کے لیے بچانا ضروری تھے۔ باقی کی ساری رقم تجارت کے لیے مختص تھی۔ سنہرے مستقبل کا خواب میرے سامنے تھا اور میں اس کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھا نظریں گھما گھما کر کرۂ ارض کے مختلف براعظموں کو دیکھ رہا تھا' جہاں میرے کارندے بڑی تن دہی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

بولٹن مارکیٹ کے سامنے والی بلڈنگ کی اوپری منزل میں بڑی گہما گہمی تھی۔ کچھ لوگ اندر گھوم رہے تھے' کچھ کھڑکیوں میں بیٹھے باہر جھانک رہے تھے۔ ایک پور ٹیبل پنواڑی پان کا پھٹہ گلے میں لٹکائے گلوریاں بنا بنا کر بیچ رہا تھا۔ مجھے کسی نے اس بلڈنگ کا پتہ دیا تھا کہ یہاں ہر نوع کا کاروبار ہوتا ہے اور یہاں سے اناڑی آدمیوں کی تجارت کا صیغہ بھی کھل سکتا ہے۔

اوپر پرانی وضع کے کمروں میں بے شمار تجارتی دفتر تھے' جہاں اپنی اپنی طرز کا کام ہو رہا تھا۔ اندر لٹکتے ہوئے پیلے پیلے بلب تو روشن تھے' لیکن کمرے دھندلے دھندلے سے تھے۔ کام کرتے ہوئے کارندوں کے چہرے ٹھیک سے دکھائی نہ دیتے تھے۔ شاید وہ انہیں ٹھیک سے دکھانے کے آرزومند بھی نہیں تھے۔ ہر دفتر میں سامنے کاؤنٹر پر ایسا کچھ ہو رہا تھا جیسا خفیہ انداز میں اندھیرے کونے میں ہو رہا ہو۔

میں جس کمرے میں رموز تجارت سمجھنے کی غرض سے داخل ہوا' اس میں سلک کا جھلجھلا سوٹ پہنے ایک کلین شیو مرد دائیں ہاتھ بیٹھی ٹائپسٹ گرل کو چٹھی لکھوا رہا تھا اور

OCIETY.COM

پٹاپٹ ایسے بولے جارہا تھا جیسے اس نے یہ چٹھی زبانی یاد کر رکھی ہو۔ بائیں جانب ایک اور گہلی سی لڑکی بڑے ٹائپ رائٹر پر بڑے بڑے فارم ٹائپ کر رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں گوانیزے تھیں اور ہلکے سانولے رنگ سے نکھر کر باہر کو نکل رہی تھیں۔ میں کرسی کھینچ کر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھ گیا' لیکن باس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ایک چٹھی ختم کرا کے اس نے دوسری شروع کرا دی!

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ مجھے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی ڈکٹیشن ختم ہو گئی تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولا "فرماؤ؟"

میں نے کہا "آپ کس چیز کی تجارت کرتے ہیں؟"

اطمینان سے بولا "ہم رودہ جرمنی بھیجتے ہیں اور ہالینڈ سے خوشبوئیں منگواتے ہیں۔"

پھر تھوڑی دیر سوچ کر بولا "آپ کسی کاروبار میں ہیں؟"

میں نے کہا "میں تو سرکاری ملازم ہوں' لیکن اب کاروبار کی سوچنے لگا ہوں۔ تھوڑی دیر تک ساتھ ساتھ نوکری کروں گا' اس کے بعد چھوڑ دوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے میرے پروگرام میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "آپ دھندہ کس چیز کا کرو گے؟"

میں نے کہا "امپورٹ کروں گا۔"

بولا "کس چیز کی؟"

میں نے کہا "کسی چیز کی بھی' جس میں زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔"

"اور ایکسپورٹ کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "ایکسپورٹ کی مجھے چنداں ضرورت نہیں۔"

وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگا۔ پھر ذرا سا مسکرایا اور سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا "امپورٹ کے لیے فارن ایکسچینج کدھر سے لاؤ گے۔"

میں نے کہا "وہ مجھے میرا بینک دے دے گا۔"

کہنے لگا "آپ کو اس دھندے کا کچھ علم ہے ایکسپورٹ امپورٹ کا؟"

میں نے کہا "تھوڑا سا کتابی علم ہے' باقی کا میں ساتھ ساتھ سیکھ جاؤں گا۔"

وہ پھر ہنسا اور اس نے سر کو پھر اسی طرح سے جھٹکا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اسے جانتا ہوں۔

WWW.PAK

کہنے لگا" پہلے آپ کو سال دو سال کی نوکری کر کے یہ کام سیکھنا چاہیے اور پھر اس میں ساتھ کسی حصے دار کو ملا کر یہ کام کرنا چاہیے۔ لیکن....." وہ رک گیا۔

میں نے کہا" لیکن کیا؟"

بولا" شرط یہ ہے کہ وہ حصے دار نیک اور ایماندار شخص ہو۔"

میں نے کہا" کیا آپ میرے ساتھ اس حصہ داری میں شریک ہو سکتے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اسی طرح سے مسکرایا' جیسے کہہ رہا ہو میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔

اس نے کرسی سے ذرا سا اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کرنے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے بڑے تپاک کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

اس نے زور کی چیخ مار کر اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑا لیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ یا مجھے ایسے لگا گویا وہ کانپ رہا ہو۔

اس کی دونوں گوانیز لڑکیاں کام روک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

وہ اپنے کاؤنٹر کا پھٹا اٹھا کر باہر نکلا اور میرے ساتھ چمٹ گیا۔

میں نے اس سے پرے ہونے کی کوشش کی تو وہ میرے ساتھ اور جڑ گیا اور ہولے ہولے کراہنے لگا۔

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا اور دل میں جلدی جلدی طرح طرح کے خیال گزرنے لگے۔

اس نے مجھ سے الگ ہو کر گردن ذرا سی اکڑا کر پوچھا" ابھی تک ریڈیو میں ہو یا محکمہ تبدیل کر لیا؟"

میں نے کہا" محکمہ تبدیل کر لیا۔ اب میں وزارت تعلیم کا ملازم ہوں۔ لاہور میں میرا دفتر ہے اور میں وہیں قیام پذیر ہوں۔"

"لیکن تم کون ہو؟" یہ میں اس سے نہ پوچھ سکا۔ اگر میں پوچھتا تو شاید وہ بتا بھی دیتا لیکن میرا یہ سب کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

وہ کہہ رہا تھا" آپ بزنس کریں تو پہلے ایک مخلص اور دیانتدار قسم کا ساتھی ڈھونڈیں' پھر اس کے ساتھ کچھ وقت گزاریں اور اس کو گرومان کر اس سے کچھ سیکھیں....."

OCIETY.COM

وہ تو اپنی رو میں بولتا چلا جاتا تھا' لیکن میں اس کے اسی سوال پر اٹکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا مانوس اور شناسا قسم کا تھا' مگر وہ میرے ذہن سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ پکڑائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کہا "میں آپ کو پہچان نہیں سکا؟"

بولا "کوشش کرو۔"

میں نے کہا "یاد کے اندر تو بہت کوشش کر کے دیکھ لی' اب باہر سے دیکھ رہا ہوں۔"

بولا "ابھی تم نے یاد کے اندر پورے طور پر جھاڑو نہیں دیا۔ ادھر ادھر کے ہاتھ چلا کر فارغ ہو گئے ہو۔ اس سے کچھ نہیں ملے گا اور کوشش کرو۔"

میں ٹکٹکی باندھ کر بڑی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور وہ فائلوں کے صفحے الٹ پلٹ کرتا مسکراتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نظریں اوپر اٹھائے بغیر مسکرا کر بولا "تم شروع ہی سے ایسے کاہل اور آسی آدمی ہو۔ تم میں ہمت نہیں ہے۔ پہلے بھی جب ملے تھے تو ایسے ہی تھس اور احدی انسان تھے۔"

یا اللہ! یہ کون ہے جو ایسی جان پہچان اور گہری واقفیت کی باتیں کر رہا ہے! گول چہرہ' کلین شیو' سرخ و سفید' ہنجاسر' کوجیک نژاد' خوش پوش' خوش گفتار' صاحب علم' زمانہ شناس' ملک التجار...... کون ہے بھائی؟ یہ کون ہے؟

اس نے میرے اندر کی آواز کو بغور سن کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھ کو دیکھا۔ پھر نہ بتانے کے انداز میں بولا "ارے بھائی میاں! میں بابا سنگل شاہ ہوں...... محمد الیاس جنجوعہ؟......"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے بے اختیار جپھی ڈالنے کو جی چاہتا تھا' لیکن وہ کاؤنٹر کے اس پار اسی طرح سے بیٹھا اپنے کاغذات لکھتا رہا۔ سٹینو لڑکی نے اسے چٹھی دی تو اس نے سونے کا پار کر نکال کر اس پر بے اعتنائی سے دستخط کیے اور مجھے کہنے لگا "میں رودے کا بیوپار کرتا ہوں۔ رودہ جرمنی ایکسپورٹ کرتا ہوں اور وہاں سے ڈائز منگواتا ہوں۔ کھانے والے رنگ اور تین قسم کی خوشبوئیں' ونیلا' سٹابری اور اناناس...... پاکستان میں' خدا کے فضل سے' اس فیلڈ میں میری ٹکر کا اور کوئی تاجر نہیں۔"

میں نے کہا "لیکن تم کو تو میں گجرات کے اڈے پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اس عرضی نویسی کا کیا بنا؟"

کہنے لگا "لالہ موسیٰ سے ذرا آگے ایک کار سوار کی درخت سے ٹکر ہو گئی تھی۔ میں

WWW.PAKS

سائیکل پر سوار کھاریاں جارہا تھا۔ بائیسکل پرے پھینک کر میں نے مشکل سے اس شخص کو کار سے نکالا۔ اسے زمین پر لٹا کر مصنوعی تنفس دیا۔ دل کی مالش کی۔ دونوں بازو کھولے' بند کیے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی جیب میں پچاس ہزار روپے کا پیکٹ تھا جو میں نے احتیاط سے نکال کر اپنی سائیکل کی گدی کے نیچے اڑس لیا۔ تھوڑی دیر بعد بہت سے لوگ ادھر جمع ہو گئے۔ میں میت ان کی حفاظت میں چھوڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

"دل بہت بے چین تھا۔ رہ رہ کر اس جوان مرگ کا خیال ستاتا تھا۔ پتہ نہیں کون بدنصیب تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا۔ کدھر سے آیا تھا' کدھر کو جانا تھا اور کدھر پہنچ گیا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ میں گجرات چھوڑ کر کراچی آ گیا اور اس رقم سے یہاں بیٹھ کر تجارت کی راہ اختیار کر لی۔ قسمت یاور تھی۔ ایک اچھا میمن گروپ مل گیا۔ اس نے روئی کی ایکسپورٹ میں ڈال دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ دھندہ کر رہا ہوں۔ حال اچھا ہے۔ مال کافی ہے۔ جب تک اس کو منظور ہو گا یہ دھندہ کرتا رہوں گا۔ پھر جو اس کا حکم ہو گا اس کے آگے سر جھکا دوں گا۔"

یہ سب کچھ سننے کے بعد میرے پاس جواب دینے کو کیا باقی رہ گیا تھا۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے ٹک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سبحان اللہ وبحمدہ' سبحان اللہ والعظیم کا ورد کرتا رہا۔

کہنے لگا "گھر سے کھانا آیا ہے' ہے تو پرہیزی قسم کا' لیکن ہم دونوں کے لیے کافی ہو گا۔ چاہو تو یہیں کھا لیتے ہیں ورنہ الفنسٹن سٹریٹ پر ایک چائنیز ہوٹل ہے وہاں چلتے ہیں۔"

پھر خود ہی کہنے لگا "یہاں کھا کر کیا کریں گے' چائنیز چلتے ہیں' وہاں کا کھانا بہت کمال کا ہے۔ ڈرم سٹکس بہت اچھی بناتے ہیں۔ فرائیڈ پرانز کا جواب نہیں..... چلو وہیں چلتے ہیں۔"

جب ہم نیچے اترے تو ایک اس کا پرانی وضع کا جونا گڑھی ڈرائیور تھا اور ایک عدد نئی امپالا کار تھی۔ اس کی سیٹ پر سخت چمڑے کی ایک چوکور گدی تھی جس پر بیٹھنے سے اس کی ریڑھ کا ورم دبا رہتا تھا۔ میں بہت ڈرتے ڈرتے بڑے تپاک سے اور نہایت لجاحت کے ساتھ اس کی کار میں داخل ہوا اور اس سے ذرا دور ہو کر بیٹھ گیا۔

کہہ رہا تھا "مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میری منزل کہاں ہے اور مجھے کیا کرنا ہے اور میرے لیے کیا کام طے ہے۔ لیکن اب کچھ کچھ محسوس ہوتا ہے کہ مجھے تجارت کرنی ہے۔ بہت سا روپیہ کمانا ہے۔ اپنے ملک کی اور اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنی ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا جہاد

OCIETY.COM

ہے!" پھر اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا "جہاد ہی ہے ناں؟"

میں نے کہا "بالکل جہاد ہے' لیکن مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ جہاد کا اصل مفہوم کیا ہے۔ بظاہر تو ہر طرح کی کوشش' جدوجہد' سعی' دوڑ دھوپ' مشقت اور تگ و دو جہاد ہی ہے' لیکن اصل جہاد کچھ اور ہوتا ہے۔"

یہی تو میں کہتا ہوں۔" اس نے چہرہ چھت کی طرف اٹھا کر کہا "میری ابتدا تو اچھی تھی اور میں نے اس میں کشٹ بھی کافی کاٹا تھا' لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا....."

"پھر سنگل ٹوٹ گیا۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا "اصل میں یہ سنگل بھی بہت کمزور ہوتا ہے۔ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔"

"ٹوٹنا تو نہیں چاہیے۔" میں نے سوالیہ انداز میں یقین دلایا۔

"ہاں ٹوٹنا تو نہیں چاہیے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن یہ جو مرد کی ذات ہے ناں اس کا سنگل پر بڑا زور ہوتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اس کا سنگل ہی کمزور ہوتا ہے۔ مجھ پر جو گزری اس کا تمہیں اچھی طرح سے علم ہے۔"

میں نے کہا "اوپر کا علم تو ہے لیکن اندر کا نہیں۔"

کہنے لگا "اب یہاں بھی ایک ہے۔"

"کوئی دوسری!"

"ہاں دوسری۔ لیکن اس کا گھر والی کو علم نہیں' وہ ابھی گجرات ہی میں ہے۔ ایک چکر لگا گئی ہے اور دو مہینے میرے ساتھ گزار بھی گئی ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا "یہ تو مرد کے کمال فن کا اظہار ہے۔ ہزاروں سال سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور اسی طرح سے ہوتا رہے گا۔ اس میں گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ سادھ کر کھانا کھانے لگا۔

کچھ دیر تک ہم خاموش کھانا کھاتے رہے اور پھر اس نے ریستوران کے باہر کراچی کی اسی ہوئی گرمی کو دیکھا جو پھٹے حالوں فقیرنی کی طرح ریستوران سے باہر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

"چینی قہوہ؟" اس نے اچانک پوچھا۔

میں نے کہا "ابھی تو ہم نے کھانا بھی ختم نہیں کیا' ابھی سے قہوہ کیسا؟"

WWW.PAK

بولا "پہلے سے کہہ دیں تو کھانا ختم کرتے ہی مل جاتا ہے۔ پھر میں ذرا جلدی میں بھی ہوں۔ میرے دو تین کیبل گرام جرمنی سے متوقع ہیں۔ کچھ مال بھیجا تھا اس کی اب تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

میں نے کہا کون سا مال اور کہاں کا مال۔ بیچ میں سے تو ردو ہی ہے 'گندا' بدبودار' پیٹ میں رہے تو آنت' باہر نکل آئے تو تانت۔"

کہنے لگا "بس بس یہ تانت ہی شیطان کی آنت ہے' جس سے میرے ازل کی ڈوری بندھی ہے۔"

میں نے کہا "تانت کے ساتھ؟"

بولا شیطان کے ساتھ! مجھ سے بڑی ہمدردی کرتا رہا۔ اڑے تھڑے وقت میں میرے کام آتا ہے۔ کوئی مشکل پڑ جائے توڑ کر ساتھ دیتا ہے۔ جتنے برس سنگل پوش رہا' میری خدمت کرتا رہا' مجھے سہارا دیتا رہا۔ میرے ہر ہر نفس کے ساتھ رہا..... لیکن میں شاید اس کا بندہ نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "خدا نہ کرے..... تم واقعی اس کے بندے نہیں ہو..... نعوذ باللہ"

گھبرا کر بولا "میں شاید خدا کا بندہ بھی نہیں ہوں..... میری راہوں میں اس کے بلاوے کی آواز نہیں پہنچی' بس اک گونج سی سنائی دیتی ہے' الفاظ سمجھ میں نہیں آتے...... لیکن یہ میری زندگی نہیں' میری زندگی کچھ اور ہے۔"

"یعنی؟" میں نے پوچھا۔

"یعنی یہی کہ میں جو کے بدلے جنت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے حیرانی سے اس کی جانب غور سے دیکھا تو اس نے کہا "آنے والے پیغمبروں میں سے کسی ایک نے بابا آدم کو طعنہ دیتے ہوئے کہا واہ بابا جی واہ! آپ نے گندم کے ایک دانے کے بدلے جنت گنوا دی اور اس سے خالی ہاتھ باہر نکل آئے۔ کیسا گھاٹے کا سودا کیا.....! بابا آدم نے اطمینان سے فرمایا کہ اب بھی جنت میری اولاد سے کوئی جو کے ایک دانے کے عوض خرید لیا کرے گا۔ جو میں نے گندم کے دانے کے بدلے فروخت کر دی...... تو میری آرزو ہے کہ میں بھی یہ سودا کروں اور اس میں کامیابی حاصل کروں۔"

میں اس کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔

کہنے لگا "میں جہاں جہاں ہوتا ہوں' وہاں بس ہوتا ہی ہوں۔ اصل میں یہ میری منزل

OCIETY.COM

نہیں ہے۔ مجھے کسی اور جگہ ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔"

بولا "وہ جہاں میں تھا۔ مری کے پہاڑوں میں' وہ میرا اصل مقام نہیں تھا۔ مجھے اس سے کافی ہٹ کے ہونا چاہیے تھا۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہ نہیں بتا سکتا' لیکن میری بے چینی مجھ سے بار بار یہی تقاضا کرتی رہتی تھی کہ تم ایک غلط مقام پر آ گئے ہو' اس کو چھوڑ دو۔"

"اور وہ اصل مقام کا کیا اشارہ دیتی تھی؟" میں نے پوچھا "تمہاری بے چینی!"

"وہ بڑی باقاعدگی سے اشارہ دیتی تھی لیکن میں سمجھ نہیں سکتا تھا..... جیسے میں اب اس محبوبہ کی آغوش میں ہوتا ہوں' اسی کراچی والی دختر قصاب کی گود میں' تو میرا دل گھبرانے لگتا ہے اور مجھے اپنی گجراتن بیوی یاد آنے لگتی ہے..... اور جب میں گجرات جا کر چند ہفتے اس کے ساتھ گزارتا ہوں تو مجھے اس کی یاد ستانے لگتی ہے' جس نے ایک مرتبہ مری میں میرے سنگل کھولے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میری جیون ساتھی نہیں ہے۔"

"کیا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

تو اس نے آرام سے کہا "میری ان کے ساتھ شناسائی ضرور ہے' لیکن ان میں سے کوئی بھی میری جیون ساتھی نہیں ہے..... میری اصل جیون ساتھی میری موت ہے جو میرے بہت ہی کمزور لمحوں میں ان چھوٹی جیون ساتھنوں کے ساتھ ایک ایرانی بلی کی طرح میرے دونوں پاؤں کے درمیان گھومنے لگتی ہے اور اپنی کھڑی دم باری باری سے میری پنڈلیوں پر بجاتی جاتی ہے۔"

اس کی ایسی سوچ کا کیا جواب دیا جا سکتا تھا بھلا!

وہ کہہ رہا تھا "اپنی من پسند موت کو گلے لگانے میں بڑی لذت ہے۔ وہ جب تمہاری شہ رگ کی طرف اپنی تھوتھنی بڑھاتی ہے تو اس کے دانتوں اور کچلیوں سے ایک عجیب طرح کی خوشبو نکلتی ہے۔ گلاب اور انناس کی خوشبو۔ یہ موت کی آمد کی خوشبو ہے اور جب وہ بہت قریب پہنچ جاتی ہے تو اس کے حلق سے جائفل اور جاوتری کی بھبک آنے لگتی ہے۔" مجھے اس کی باتیں سن کر خوف آنے لگا' لیکن وہ بڑے اطمینان سے باہر سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا اور خوش تھا کہ اس کو اپنے من کی باتیں سنانے کے لیے کوئی جھڈو ڈھانڈا مل گیا ہے۔

WWW.PAK

میں اس سے جب بھی بزنس کی کوئی بات چھیڑتا یا حرفت کی اوٹ سے نکل کر کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا وہ مجھے ہر مرتبہ خالی دے کر جہاد کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے اسے ہمیشہ ایک جنگجو کے روپ میں زندہ رہنا چاہیے۔ ایک دلدور مبارز کی شکل میں۔ اس سے اس کے اندر کی حقیقت واضح طور پر عیاں رہتی ہے اور دیکھنے والے کو کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا۔ وہ شخص جس کی تلوار ہر وقت اس کے پہلو میں آویزاں رہتی ہے اس کے اندر کسی قسم کی آلائش جمع نہیں ہوتی۔ وہ اندر باہر سے شفاف ہوتا ہے۔"

صاحب السیف ہونے کے لیے جہاد کا رخ ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک ذہن میں جہاد کی جہت نہیں ہوگی' انسان کا سیدھا ہونا ممکن ہی نہیں۔ جس طرح قطب نما کی سوئی ہر وقت شمال کا رخ کر کے لرزتی رہتی ہے' اسی طرح انسانی وجود اگر جہاد کی طرف رخ کر کے لرزتا رہے تو اس کے اندر کوئی خرابی نہیں رہتی اور وہ ہر طرح کی ذہنی' جسمانی' نفسی اور نفسیاتی بیماری سے امیون ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا "تم نے یہ سب کچھ کیونکر جانا؟"

بولا "یہ میرا شخصی تجربہ ہے۔"

میں زور سے ہنسا اور میرے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ کر میز سے پرے جا گرا۔ اس نے میرے اس غیر ارادی فعل کو خاطر میں لائے بغیر کہا "میرے اندر کی سوئی بھی قطب نما کی طرح ارتعاش پذیر ہوتی ہے' مگر کبھی کبھی۔ اس وقت میں ایک اور شخص ہوتا ہوں۔ ایک اور آدمی۔ بہت ہی پرانے زمانے کا ایک شمشیر زن۔ کئی کئی مرتبہ بڑی بڑی دیر تک یہ کیفیت ہوتی ہے پھر میں واپس اپنے گندی گدی پر لوٹ آتا ہوں۔"

"اپنی اصل سیٹ پر!" میں نے طنز آکہا۔

کہنے لگا "لیکن وہ شاید میری اصل سیٹ نہیں ہے۔"

"مگر یہ تم نے کیونکر جانا؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔"

اس نے ہلکے گولڈن رنگ کا قہوہ پیالی میں ڈالتے ہوئے کہا "لکھنؤ میں ایک خان صاحب تھے جو ٹھاکروں کی طرح ڈاڑھی چڑھاتے تھے اور لبیں بڑھا کر مونچھوں کو تاؤ دے کر رکھتے تھے۔ لباس بھی کچھ ایسا ہی کافرانہ ان کو پسند تھا۔ فسق کی یہ ظاہری صورت تھی۔"

میں نے کہا "اگر ظاہری صورت ایسی زوردار تھی تو اندر کی کیفیت کیا ہوگی؟"

بولا "دنیا بھر کی بازیاں ان کے اندر موجود تھیں' جن میں سے ایک ایک کا تعلق فسق و فجور کی اعلیٰ سے اعلیٰ شق سے منسلک تھا۔ شام کو ولایتی بوتل منگوا کر گھونٹ گھونٹ کر کے پیتے اور رنڈی کو ران پر بٹھا کر اس کا مجرا سنتے۔ خوش' نہال ہو کر سازندوں کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر لہک لہک کے گاتے اور لوٹ لوٹ جاتے۔ جب کوئی کہتا خان صاحب اب عمر رسیدہ ہو گئے ہو' قبر میں جانے کا وقت قریب آگیا ہے' اب تو توبہ کر لو۔ تو خان صاحب حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھتے۔ وہ آدمی بڑی دردمندی کے ساتھ رک رک کر کہتا۔ نماز پڑھو' روزہ رکھو' مال و دولت رکھتے ہو' حج کر آؤ۔ تو خان صاحب پوچھتے نماز پڑھ کر' روزہ رکھ کر کیا ملے گا؟ لوگ جواب دیتے جنت ملے گی۔ اللہ کا دیدار نصیب ہو گا۔

خان صاحب پوچھتے جنت کے واسطے اتنی محنت' ایسی مشقت! پھر ہنس کر کہتے میاں کوئی وقت ایسا آوے گا کہ ایک ہاتھ ادھر' ایک ہاتھ ادھر' کائی سی پھٹ جائے گی اور کھٹ سے جنت میں جا کھڑے ہوں گے۔ جنت میں جانا کون سا مشکل کام ہے۔"

"اتنا زعم!" میں نے حیرانی سے کہا۔

کہنے لگا "اب خان صاحب کی اس بات کو کوئی نہ سمجھتا..... لیکن جلدی وقت آگیا' جس وقت مولوی امیر علی صاحب ہنومان گڑھی پر جہاد کے لیے تشریف لے گئے تو بہت سے مسلمان تیار ہو گئے۔ ہمارے خان صاحب بھی مولوی صاحب کے پاس پہنچے اور کہا مولوی صاحب ہم جیسے گنہگاروں کو بھی اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ خان صاحب مانع کون ہے اور آپ کی راہ میں حائل کون ہو سکتا ہے۔ راہ حق کا جہاد ہے کسی کا کوئی اجارہ نہیں۔

خان صاحب صافہ باندھ کر اور ہاتھ میں خاندانی تلوار لے کر میدان جنگ میں پہنچے۔ ایک ہاتھ ادھر اور ایک ہاتھ ادھر چلانا شروع کر دیا۔ شمشیر زنی کا پرانا خاندانی فن ہر ہر بڑھت پر ساتھ دیتا گیا۔ ایک کثیر تعداد کافروں کی ختم کر دی۔ اب کسی کافر کا ہاتھ خان صاحب پر پڑ گیا۔ ایک دم کائی سی پھٹ گئی اور کھٹ سے سیدھے جنت میں جا کھڑے ہوئے۔ بظاہر فاسق تھے' مگر باطن میں عاشق تھے۔ جھنڈی لوٹ کر لے گئے۔"

میں نے کہا "آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

کہنے لگا "میں بھی عاشق ہوں پر میرے اوپر کالک جمی ہے' چھٹتے چھٹتے چھٹے گی۔ لیکن پتہ نہیں..... اس عرصے میں وفات بھی ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو آپ کو بہت سے کام کرنے ہیں۔ صنعت

WWW.PAK

کو فروغ دینا ہے کارخانے لگانے ہیں' غیر ملکوں میں برانچیں قائم کرنی ہیں۔"

بولا "ارادہ تو یہی ہے لیکن پتہ نہیں یہ بیل منڈھے چڑھے گی بھی کہ نہیں۔"

پھر وہ جہاد کا فلسفہ چھوڑ کر کاروباری باتیں کرنے لگا اور اس میں اتنی دور تک چلا گ کہ اس نے چرس کی سمگلنگ کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے اور ایک انٹرنیشنل سمگلر کے طور پر خود ایک فلمی ہیرو سا بن کر کھڑا ہو گیا اور ریستوران ہی کے اندر ڈرامہ سا کرنے لگا۔ اس کا یہ جذبہ' جذبہ جہاد سے بھی بڑھ کر عیاں ہونے لگا اور دیکھتے دیکھتے اس کے سارے وجود پر محیط ہو گیا۔

کہنے لگا "دولت سے بڑھ کر اور کوئی حسین شے اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس کے زخرے پر چہرہ رکھ دو تو سارے زمانے کی خوشبوئیں سمٹ کر اس نقطے پر آجاتی ہیں محبوب کے گلے کی خوشبو ساری خوشبوؤں سے افضل ہے اور دولت کی خوشبو اس سے بھی بہت اوپر نکل جاتی ہے۔" پھر اس نے رک کر غور سے میری طرف دیکھا او کہنے لگا "تم نے سٹیٹ بینک سے آئے نوٹوں کی تازہ گڈی سونگھ کر دیکھی ہے.....؟ سونگ کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں..... اسے قریب سے دیکھنے کی طلب ہو تو وہ خوشبو آپ سے آپ آنے لگتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ جب ابا عید پر عیدی دینے کے لیے نئے نوٹ بینک سے منگوایا کرتے تھے تو ان میں سے ایسی خوشبو آتی تھی۔

میں نے کہا "مجھے یاد ہے اور میں نے اس خوشبو کو کئی بار اپنے وجود کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ مہینے کی پہلی تاریخوں میں جب میں اپنی قمیص اتار کر کھونٹی پر لٹکایا کرتا ہوں تو میری جیب سے تازہ نوٹوں کی خوشبو آیا کرتی ہے' حالانکہ نوٹ کب کے خرچ ہو چکے ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا "دولت کی خوشبو دنیا کی ساری خوشبوؤں سے افضل ہے۔ اس میں دونوں مہکیں شامل ہوتی ہیں۔"

"دونوں مہکیں!" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا "اس میں دلہن کی سیج کی باس بھی ہوتی ہے اور جنازے کی چادر کی خوشبو بھی اور دونوں ایک ساتھ ملی ہوتی ہیں..... میں نے سوئٹزر لینڈ کی شونیف کمپنی سے یہ ٹھیک خوشبو بنوا کر منگوائی تھی۔ بڑی مفید ثابت ہوئی....."

"جنازے کی خوشبو!" میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

OCIETY.COM

"نہیں نہیں۔" اس نے جھٹک کر کہا "جنازے کی خوشبو نہیں جھلے' تازہ نوٹوں کی خوشبو..... میں نے اس خوشبو کے زور پر بڑے مزے لوٹے ہیں اور مشکل سے مشکل عورتوں کو آسان کر کے اپنے ساتھ لپیٹا ہے۔ وہ جیبوں' گندھوں' کنپٹیوں اور ہتھیلیوں پر ملی ہوئی اس خوشبو کی سگندھ پا کر تمہارے ساتھ لپٹتی چلی جاتی ہیں۔"

"اور جیبیں خالی ہوتی ہیں۔" میں نے اٹھلا کر کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر چماکا مارنے کے انداز میں ہونٹ کھول کر کہا "بالکل خالی نہیں ہوتیں' ان میں بھی کچھ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تم تجارت کرنے کی غرض سے یہاں آئے ہو کہ خوشبوؤں کے مزے لوٹنے کو آ بیٹھے ہو؟"

کہنے لگا "دولت بھی زن پلتی کی طرح بڑی جاذب..... دلکش اور کشندہ چیز ہے' جس طرح خاص ایام میں عورت کے وجود سے ایک مخصوص قسم کی مہک آتی ہے' اسی طرح یہ بھی شکی جنوں کی طرح "آدم بو' آدم بو" پکارتی چلتی ہے۔"

میں نے کہا "تم بھی کمال کے احمق انسان ہو' کبھی اس کی خوشبو کی بات کرتے ہو کبھی اس کو بدبو میں بدل دیتے ہو۔ ایک پڑ پر قائم رہو۔"

سنجیدگی سے بولا "تم نے کبھی باسی پھولوں کے گل سڑ جانے کے بعد ان کی بدبو سونگھی ہے۔ خوشبودار پھلوں کو پھپھوندی لگ جانے کے بعد ان کو چھو کر اپنی انگلی سونگھ کر دیکھی ہے۔"

میں حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

بولا "اب یہ دولت جس کے نوٹوں سے ایسی اچھی خوشبو آتی ہے' غلاظت بھی ہے' یہ اجابت ہے۔ جس طرح انسانی بدن میں غذا کی گردش بتدریج متعلقہ خانوں میں ہوتی رہے تو صحت کا سلسلہ قائم رہتا ہے' لیکن اگر یہ گردش رک جائے تو قبض کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس سے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔"

ہمارے شہر کا سب سے امیر آدمی نتھو چرچرا تھا اور اس کو ہر وقت جان کے لالے پڑے رہتے تھے۔ گھر کے باہر ڈیوڑھی میں اس کو ہر روز حقنہ ہوتا تھا اور اس کی کراہیں دور دور تک جاتی تھیں۔ ہم سکول سے آتے ہوئے نتھو چرچرے کی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی آہوں اور کراہوں کے مزے لوٹا کرتے تھے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

سنگل شاہ نے کہا "جب دولت پر دولت ٹھونسی جائے اور نکاسی کے راستے بند کر دیئے

جائیں تو جان لیوا قبض ہو جاتی ہے۔ دولت دراصل شٹ ہے۔ اس کو جمع کرتے جائیں تو بدبودار اروڑی بن جاتی ہے۔ بکھیرتے جائیں تو اعلیٰ درجے کی کھاد بن جاتی ہے جس سے رنگارنگ پودے، پھل اور پھول پیدا ہوتے ہیں اور لوگ سیر گل کے لیے دور دور سے چل کر آتے ہیں..... دولت میں اور شٹ میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں ہی خوشحالی کی ضامن ہوتی ہیں۔ ایک معاشرے میں دوسری خیابان میں۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ جب میرے چہرے پر اس کی ٹکٹکی سے گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے تو وہ کہنے لگا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دولت کوئی چیز نہیں ہے کوئی شے نہیں ہے، یہ ایک عمل ہے..... تم یوں سمجھو کہ زندگی کی عبارت میں دولت ایک ناؤن نہیں، بلکہ یہ ایک فعل کے طور پر اور متعلق فعل کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ دولت ایک اسم نہیں یہ ایک فعل ہے۔"

میں نے کہا "سنگل شاہ تم تجارت کرتے ہو کہ سکول ماسٹری؟"

دونوں ساتھ ساتھ میں۔ ایک میں سے ایک نکلتی ہے۔"

وہ اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھتے ہوئے بولا "میں نے بڑے سال فقیری میں لگائے اور بہت دور تک پہنچا مگر اب دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ امیری فقیری سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں روحانیت کا رنگ غالب ہے۔ آدمی ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا ہے۔ مستقبل کے خوف سے کانپتا ہے۔ حال میں زندہ نہیں رہ سکتا..... بات یہ ہے کہ دولت چیزوں کو رخ دیتی ہے، خلق کرتی ہے، جنم دیتی ہے، وجود میں لاتی ہے، یہ دنیا میں عمل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ اقتصادیات کی شرع کی فقہہ بھی ہے اور اس کی معرفت شناس بھی۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی کا دارومدار اس پر ہے۔ لیکن انسان کا اندر اس سے احتراز بھی کرتا ہے۔ پھر دنیا پر قابض طاقتور سکہ آگے بڑھ کر اس احتراز کی سزا بھی دیتا ہے۔ گوشمالی کرتا ہے۔ خوب ٹھکائی کرتا ہے۔ جوں جوں اس کا بطلان ہو گا اس کی سزا خوفناک ہوتی جائے گی۔ اس کی عقوبت بڑھتی جائے گی۔"

اس نے کہا "میں تین مرتبہ ولایت گیا ہوں اور وہاں جا کر میں نے محسوس کیا ہے کہ اقتصادیات دولت کو راہ راست پر لانے سے معذور ہے۔ دولت ناخلف اولاد کی طرح اکنامکس کی ایک نہیں مانتی، جو دل میں آتا ہے کرتی ہے۔ اکنامکس ڈری ڈری، سہمی سہمی، شرمندہ شرمندہ اپنی ڈگڈی بجائے چلی جاتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اعداد و شمار دولت کے بھالو کو نہ تو ڈور پر لگا سکتے ہیں نہ اسے اپنی مرضی کے مطابق تماشا دکھانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"

پھر اس نے اپنی گرگابی پہنتے ہوئے کہا "یہ جو اکنامکس ہے ناں' یہ چیمبر آف کامرس..... یہ سٹہ' یہ ملٹی نیشنل' یہ سب ایک طرح سے دولت کا عصبی اختلال ہیں۔ اس کا نیورو سس ہیں' جو اس درندے کو حملہ آور ہونے سے روکتے ہیں۔ لوگوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن لوگ بچتے نہیں' ضرب شدید کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جوش میں آ کر بولا "یہ جو ماہرین اقتصادیات ہیں' بروکر ہیں' اکاؤنٹینٹ' سرمایہ کار اور مالی مشیر ہیں یہ سارے کے سارے دولت کے مندر کے پجاری ہیں جو دن رات اس کی آرتی اتارتے ہیں اور اس کی شان میں بھجن گایا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ خدا کا خوف کرو سنگل شاہ یہ تم نے کیا نئی کتھا شروع کر دی' کہاں سے چلے تھے اور کدھر پہنچ گئے۔ اوپر کی اڑان کس طرح پستیوں میں اتر گئی۔ تم تو وہ رہے ہی نہیں ہو جو تھے۔ تم وہ ہو ہی نہیں جس کو میں جانتا تھا۔ میری نظروں میں تو تم ایک ہیرو تھے اور اب ایک معمولی انسان بھی نہیں رہے۔"

کہنے لگا "یہ جو دولت ہے ناں یہ ہیرو کی اور اس کے کارہائے نمایاں کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ بس اسی میں یہ وصف موجود ہے اور کسی شے میں نہیں۔"

پھر اس نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور کہنے لگا "اس نوٹ پر قائداعظمؒ کی تصویر دیکھ رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ فخریہ انداز میں بولا "یہ سو روپے کا نوٹ قائداعظمؒ کو اس سرزمین کے ہیرو کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ یہ ایک کرنسی نوٹ ہی نہیں میرے قائد کے ہونے کا ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ اس نوٹ پر ان کی تصویر ہی نہیں ان کی اسی تقریر کا ساؤنڈ ٹریک بھی موجود ہے جو انہوں نے پاکستان سٹیٹ بینک کے اجراء پر کی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ساری متحرک فلمیں یاد آ جاتی ہیں جو قائداعظم کی ذات سے' ان کی جدوجہد سے اور ان کے لازوال ایقان سے تعلق رکھتی ہیں۔ دولت' بہادروں کی عظمت کے قصے' ان کی پوری جزیات کے ساتھ یاد رکھتی ہے۔ نہ صرف یاد رکھتی ہے بلکہ ان کی یاد دلاتی بھی رہتی ہے۔ دولت گند ہے' غلاظت ہے' نجاست ہے' عفونت اور بساند ہے لیکن ساتھ ہی سگندھ ہے' باس ہے' مہکار ہے' شمیم ہے۔ اس سے رکے ہوئے کام چل پڑتے ہیں اور چلتے ہوئے اجسام ساکت ہو جاتے ہیں۔ یہ موت سے زندگی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو موت میں داخل کر دیتی ہے۔ جتنے بھی بھگت' اولیاءاللہ' شہید' سورے اس دنیا کو ارفع اقدار عطا کر گئے' دولت ان کی یادوں کو سہارا

دیتی ہے۔ ان کے دن مناتی ہے۔ ان کی برسیاں کرتی ہے۔ ان کے تیج کرتی ہے۔ ان کے عرس مناتی ہے۔ دولت نہ ہو تو فقیروں اور بزرگوں کے مزاروں کی تزئین و آرائش نہ ہو سکے۔ ان کے گرد عقیدت مندوں کی بستیوں کو مہنگے بھاؤ خرید کر ان آستانوں کو وسعت نہ دی جا سکے۔ ان کے مرقدوں کے ارد گرد گلستان نہ بن سکیں۔ اس کے ذریعے قدیم ہیروس کی سلامی اتاری جاتی ہے اور اس کے بل بوتے پر گزرے ہوؤں کو زندہ کیا جاتا ہے۔"

کہنے لگا "اصل میں دولت ہی ٹائم ہے۔ یہی ٹائم کی کہانی کی اصل ہیرو ہے۔ انسانی ذہن گھوم پھر کر کھود کھود کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تصوراتی خواب بنتا ہے۔ پھر ان خوابوں کو وہ وقت کی سرزمین میں بوتا ہے تو ان مشکل خوابوں کو وقت کی سنگلاخ زمین میں بونے کے لیے دولت ہی اس کا واحد ذریعہ اور سہارا بنتی ہے۔"

میں نے جب اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تو وہ ہنسنے لگا اور مجھے اس کی ہنسی میں ایک مرتبہ پھر وہی معصومیت نظر آئی جو اس بے وقوف سنگل پوش کے چہرے پر ایک چھوٹی سی سبزی مائل چڑیا کے روپ میں آ کر بیٹھ جاتی تھی اور ایک مرتبہ ادھر ادھر دیکھ کر پر پھیلا کر سو جاتی تھی۔

میں پورا ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہا اور تجارت کرنے کے لیے ہر قسم کی مدد کا وعدہ اور عملی سہولت کی یقین دہانیوں کا مظاہرہ دیکھ کر واپس آ گیا۔ میرے لیے تجارت ایک پیچیدہ غلام گردش تھی جس کے ہر کونے میں ایک ننگ دھڑنگ کالا بھجنگ ڈنڈا پکڑ کر بیٹھا تھا اور میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس ڈنڈے کو فرش پر بجانے لگتا تھا۔

میں درخت کی اونچی شاخ پر ہاتھ نہ پڑنے کی وجہ سے لنگور کی طرح واپس اپنے ٹبے پر آ گیا۔

OCIETY.COM